رزاق شاہد کوہلر

مرض
مزے مزے کے

بڑے بھیا فوج سے واپس کیا آئے گھر کے ساتھ ساتھ پورے قصبے کی شامت آگئی۔ سبکدوش ہونے والے ہر فوجی کی طرح وہ بھی اس مہلک مرض سے نہیں بچ پائے تھے جسے عرف عام میں ''ڈسپلین (نظم و ضبط)'' کا عارضہ کہتے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ دل کے عارضہ کی طرح مریض کے لئے خطرناک یا باعث پریشانی نہیں لیکن اس کے لواحقین کے لئے باعث آزار اور کبھی کبھار جان لیوا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ بتانے والے بتاتے ہیں ایک فوجی جوان طویل عرصہ کے بعد چھٹی لے کر گھر آیا تو اس کی عمر رسیدہ ماں اس کی بلائیں لیتے لیتے نڈھال ہو گئی۔ رات کے وقت جب بڑھیا کفگیر سنبھال کر اپنے فوجی سپوت کے لئے دیگچی سے سالن نکالنے لگی تو وہ ماں کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ بڑھیا جب تیسری مرتبہ سالن سے لبالب کفگیر پلیٹ کی طرف بڑھانے لگی تو اچانک اس کا فوجی سپوت چلایا'' ہولڈ ہولڈ (Hold Hold) یعنی بس کرو بس کرو۔ مگر بڑھیا کا کفگیر تو جب رکتا جب وہ ہولڈ کا مطلب سمجھتی۔ فوجی کا پارہ اتنا چڑھا کہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پاس پڑی ایک موٹی سی لکڑی اٹھا کر ماں کے سر پر دے ماری۔ بڑھیا مع کفگیر لڑھک گئی۔ وہ بڑبڑا کر بولا '' ہولڈ کی آواز سن کر پوری فوج کی پلٹن رک جاتی ہے پھر تیری ڈوئی کیوں نہیں رکی؟ آخر ڈسپلن بھی کوئی چیز ہے۔''

قارئین! دل چھوٹا مت کیجئے کیونکہ ڈسپلن کا یہ عارضہ فوجی حضرات کو ہی لاحق ہوتا ہے۔ عوام الناس کو مستفید ہونے کا موقع اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ البتہ عوام چاہیں تو وہ ٹینشن (تناؤ) جیسے بے ضرر مرض سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل ٹینشن بطور فیشن رائج ہے۔ شہروں کا ہر دوسرا آدمی اس فیشنی مرض میں مبتلا نظر آتا ہے۔ دیہات میں اس کی اکثریت اس بدیسی مرض سے محفوظ ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے کے جہاں بے شمار فوائد ہیں وہاں تناؤ جیسی نعمت غیر مترقبہ بھی حاصل ہوتی ہے۔ ہاتھ آئی دولت کون کافر ٹھکراتا ہے' اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ اس سے خوب مستفید ہو رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست ڈاکٹر سلیم کا کلینک ان کی رہائش سے متصل ہے۔ اس لئے مریض وقت بے وقت ان سے مفت مشورے طلب کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ ایک دن عین دوپہر کے وقت جب محو استراحت ڈاکٹر صاحب 'ٹینشن' کے مزے لوٹ رہے تھے اچانک دوروازے کی گھنٹی بجی۔ موصوف چارونا چار اٹھے اور اپنے آپ کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔ ''دوپہر کے اس وقت کون آیا ہے؟'' انہوں نے تناؤ دار لہجے میں دروازہ کھولے

بغیر سوال کیا۔

''میں ہوں جی ڈاکٹر صاحب۔'' باہر سے ٹینشن کو مزید ہوا دینے والا جواب موصول ہوا۔

'' ارے میں کا کوئی نام بھی تو ہوتا ہے چاہے وہ چوپایوں میں سے کیوں نہ ہو۔''

''میں ..... میں جی قاسو قصائی ہوں ڈاکٹر صاحب! مجھے بہت تیز بخار ہے۔ خدا کے لئے مجھے دیکھ لیجئے میں آپ کے بچوں کو دعائیں دوں گا۔''

باہر سے 'میں' کا یہ جواب تو سونے پہ سہاگا تھا۔ کنوارے آدمی کے بچوں کو دعائیں دینا ویسے بھی گالی کے زمرے میں آتا ہے اور وہ بھی ایک ٹینشن زدہ ڈاکٹر کو، تاہم موصوف صبر و تحمل کا قابل رشک مظاہرہ کرتے ہوئے بولے ''میاں وقت دیکھا ہے ' سورج سوا نیزے پر آچکا ہے اور گرمی سے دم نکلا جارہا ہے۔ بھلا یہ بھی بیمار ہونے کا وقت ہے جاؤ شام کو آنا''

یہ فرما کر ڈاکٹر صاحب موصوف واپس پلٹ آئے اور قاسو قصائی باہر کھڑا ڈاکٹر صاحب کی شان میں قصیدہ گوئی کرتا رہ گیا۔

شام کی بات ہے ہم ڈاکٹر موصوف کے کلینک میں تشریف لے گئے اور حالات حاضرہ کی بگڑتی ہوئی صحت کا رونا رونے لگے مگر وہ چپ چاپ بیٹھے چھت کے پنکھے کو گھورتے رہے۔ شاید دماغ میں پڑی کوئی گرہ کھولنے میں مصروف تھے۔

اچانک جاہلانہ وضع قطع کا ایک شخص کلینک میں دندناتا ہوا داخل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اس کے قدموں کی چاپ سن کر چار و ناچار بحر خیالات سے باہر نکل آئے۔ ایک نگاہ غلط انداز نووارد پر ڈالی اور دوبارہ پہلے والے شغل میں لگ گئے۔

موصوف کی یہ حالت دیکھ کر نووارد کو اپنی کم مائیگی اور ہمیں بھینس کے آگے بین بجانے کا احساس ایک ساتھ ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب! شام ہو گئی ہے۔'' نووارد کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک لمحے کے لئے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا اور پھر جھنجھلا کر بولے ''کیا میں اندھا ہوں؟''

''نہ جی نہ' اللہ نہ کرے'' آپ تو آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں۔'' اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

''تو پھر مجھے شام ہونے کی اطلاع دینا کیا ضروری تھا؟'' اس بار لہجے میں تناؤ اور بیزاری کی ملی جلی کیفیت تھی۔

''نہ جی ڈاکٹر صاحب! میں شام ہونے کی اطلاع دینے نہیں آیا۔''

''تو کیا تصویر اتروانے کیلئے آئے ہو؟''

''توبہ کریں جی توبہ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔''

''میں نے کب کہا کہ میں فوٹوگرافر ہوں''

نووارد سٹپٹا گیا'' ڈاکٹر صاحب! آپ..... آپ ہی نے تو کہا تھا شام کو آنا۔ میں اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد بہترین نسخہ لکھ دوں گا۔''

''اچھا..... تو آپ وہ والے مریض ہیں۔'' انداز گفتگو میں ندامت اور خجالت کے بجائے حیرت کی فراوانی تھی۔

جب مریض کو نمٹا چکے تو ہم نے سوالیہ انداز میں ان سے پوچھا ''میاں! آپ تو روز بروز بھلکڑ ہوتے جارہے ہیں آخر وجہ کیا ہے؟''

''بس جی کیا بتائیں اس 'ٹینشن' اور 'ڈیپریشن' نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اب تو یہ حال ہے کہ دوپہر کا کھانا شام کو اور رات کا کھانا صبح کو کھاتا ہوں۔ ناشتے کا تو نام بھی یاد نہیں رہا۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ میں وکیل ہوتا۔''

''بجا فرمایا ہے' ادھر سائل کو پھانسی ہو چکی ہوتی ادھر آپ فائل ڈھونڈ رہے ہوتے۔''

موصوف کھسیانی ہنسی ہنس کر دوبارہ چھت کے پنکھے کو گھورنے لگے۔ عالم تناؤ میں عموماً وہ یہی شغل فرماتے ہیں۔ دن بھر میں اتنے مریض نہیں دیکھتے جتنی بار پنکھے کے پر شمار کرتے ہیں۔

خیر ذکر ہو رہا تھا ڈسپلن کے عارضے کا اور بات جا پہنچی ٹینشن تک! شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم بے پر کی اڑا رہے ہیں مگر ایسی کوئی بات نہیں اگر ایک مشہور و معروف شاعر قیامت کا ذکر چھیڑ کر محبوب کی جوانی تک پہنچ سکتا ہے تو ہم ڈسپلن سے ٹینشن تک کیوں نہیں جاسکتے؟ ویسے بھی یہ دونوں ملتے جلتے الفاظ ہیں یا بقول ہمارے عوارض ہیں جبکہ قیامت اور محبوب کی جوانی میں بظاہر کوئی مماثلت نظر نہیں آتی، اگر ہے بھی تو وہ شاعر کو ہی نظر آتی ہوگی۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اگر قیامت نظر آنے والے محبوب سے شاعر کی شادی ہو جاتی تو موصوف شعر میں ترمیم ضرور فرماتے بلکہ ببانگ دہل یہ کہتے پھرتے ؎

ذکر چھڑ گیا جہنم کا
بات پہنچی منے کی اماں تک

(اگر شاعر موصوف زندوں میں شامل نہیں تو ان کی روح اور شادی شدہ خواتین سے معذرت)۔ یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کچھ قارئین اس خالی خولی معذرت کو درخور اعتنا نہیں سمجھیں گے۔ اس لئے دل پر پتھر رکھ کر اصل شعر جوں کا توں پیش ہے تاکہ محبوب کی جوانی کو قیامت سے تشبیہ دینے والے حضرات عقل کے ناخن لے کر اس سے شادی کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔

اصل شعر یوں ہے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تری جوانی تک

اب اگر معترض اعتراض کرتے ہیں تو شوق سے کرتے رہیں 'ہم تو یہی کہیں گے کہ 'ڈسپلن' اور 'ٹینشن' عوارض ہی ہیں اور ان میں مماثلت بھی ہے۔ البتہ محبوب کی جوانی کا پول ہم پر کھلے ایک برس ہونے والا ہے۔ اس سانحے کی رونمائی سے پہلے ہم ان کی گلی میں کسی پھیری والے کی طرح بلاناغہ حاضری دیا کرتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ جلد یا بدیر خود پھیری والا بننے والے ہیں۔

اس دوران میں بڑے بھیا کا عارضہ (نظم و ضبط) ڈسپلن

بھی روز بروز خطرناک صورت حال اختیار کرتا جارہا ہے ۔ بقول ایک باریش بزرگ کے جو رشتے میں ہمارے ابا جان لگتے ہیں ''اب یہ عارضہ نہیں رہا ہٹ دھرمی بن چکا ہے۔''

چند دن قبل ہم صحن میں چارپائی ڈالے موسم سرما کی خوشگوار دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ بلائے ناگہانی کی طرح بڑے بھیا آ ٹپکے۔

''یہ چارپائی کس طرح بچھا رکھی ہے ؟''انداز طنزیہ ہی تھا۔ ''شرقاً غرباً بھیا۔''

''احمق ہو تم بھلا اس طرح بھی کوئی چارپائی بچھاتا ہے۔''ہم بوکھلا کر اٹھے فوراً چارپائی کو پائینتی کی جانب سے پکڑ کر اس کا رخ شمالاً جنوباً کر دیا اور داد طلب نظروں سے بھیا کو دیکھنے لگے۔

''اب بھی غلط طریقے سے بچھائی ہے ۔تم میں حسن انتظام کی شدید کمی ہے۔''

جواب حسب توقع ہی تھا کیونکہ بھیا کا شمار ان نقادوں میں ہوتا ہے جو تنقید برائے تنقید کے عادی ہیں۔

''بھیا اسے عموداً نہیں بچھایا جاسکتا۔''ہم نے پہلی بار زچ ہو کر کہا۔

''میں نے کب کہا کہ عموداً بچھاؤ۔''

''بھیا!''ہمارے چہرے پر جہاں بھر کی مسکینی و یتیمی طاری ہو چکی تھی ۔آپ کو شرقاً غرباً بچھی ہوئی چارپائی غلط نظر آتی ہے اور شمالاً جنوباً بھی!اب ہم اسے بچھائیں تو کس طرح ؟''

جواب ملا'' چارپائی کو غور سے دیکھو تمہیں اپنی غلطی کا خود احساس ہو جائے گا۔''

ہم نے بہتیرا دیدے پھاڑ پھاڑ کر چارپائی کو غور سے دیکھا مگر اپنی غلطی کا احساس کسی طرح نہ ہوا۔ہم شکست خوردہ انداز میں دوبارہ بھیا کو دیکھنے لگے۔ موصوف نے ماتھے پر تیوری ڈالی اور پھر کڑک کر بولے'' چارپائی کی پائینتی کی طرف غور سے دیکھو' یہ جنوب کی بجائے ذرا سی جنوب مغرب کی طرف کھسکی ہوئی ہے۔اسی طرح چارپائی کا مخالف حصہ بھی معمولی سا شمال مشرق کی طرف نظر آرہا ہے۔ تمہیں شاید اس لئے نظر نہیں آیا کہ عقل کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی کہیں گروی رکھ چکے ہو۔میں نے اپنی عسکری زندگی میں بڑے بڑے کند ذہن دیکھے ہیں لیکن تمہارے پائے کا پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''معاف کرنا بھیا''۔ہم نے جان چھڑانے والے انداز میں جواب دیا۔ آئندہ چارپائی بچھاتے وقت قطب نما استعمال کریں گے۔''

دراصل چھبیس سالہ عسکری زندگی میں بڑے بھیا کو ڈسپلن کا چسکا کچھ اس طرح پڑا ہے کہ بتانا محال ہے۔بقول شاعر

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

کچھ اسی طرح کا حال بڑے بھیا کا بھی ہے۔اگر ان کی زندگی سے ڈسپلن نکال دیا جائے تو وہ بغیر سوئیوں والی گھڑی کی طرح نظر آئیں گے ۔ہماری دو بھابیاں ان کے اس ڈسپلن کی نذر ہو چکی ہیں،دیکھتے ہیں تیسری بھابھی کا کیا بنتا ہے۔

وہ بچاری ایک برس سے ڈسپلن سیکھ رہی ہیں لیکن بھیا کہتے ہیں تم ابھی طفل مکتب ہو۔ڈسپلن سیکھنے کے لئے فوج میں جانا پڑتا ہے۔ کئی طرح کے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ رانجھے کی طرح بھینس چرانا اور قیس کی مانند صحراؤں کی خاک چھاننا پڑتی ہے تب کہیں جا کر انسان تھوڑا بہت ڈسپلن سے واقف ہوتا ہے۔یہ کوئی سیکھنے والا کام نہیں ہے۔

ویسے کسی حد تک بڑے بھیا ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ڈسپلن سیکھنے سے نہیں آتا۔ بھلا مرض بھی کہیں سیکھنے سے آتے ہیں ؟ہم نے تو آج تک کسی کو نزلہ زکام 'بخار 'پیٹ یا سر درد کی مشق کرتے ہوئے نہیں دیکھا .....سوائے آخر الذکر مرض کے جس کی مشق اکثر خواتین کرتی رہتی ہیں کہ شوہروں کو الو بنانے کا اس سے عمدہ طریقہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔

شوہر سے کوئی بات منوانے کے سلسلے میں دور اندیش اور پڑھی لکھی خواتین میں سر درد کا عارضہ بہت مقبول ہے۔کچھ عرصہ بعد بیوٹی پالروں کی طرح سر درد مرکز بھی کھلنا شروع ہو جائیں جن کی پیشانی پر کچھ اس طرح کی عبارت لکھی ملے گی۔

''کم پڑھی لکھی اور ناخواندہ خواتین کو معقول معاوضے پر عملی تربیت دینے والا حکومت پاکستان سے منظور شدہ بہترین ادارہ۔''

بہر کیف یار لوگ کچھ بھی کہتے پھریں ،ہم نے تو ان عوارض سے متاثرہ لوگوں سے مل کر ہمیشہ نامعلوم سی خوشی محسوس کی ہے ۔سوائے اپنی نصف بہتر کے جو ہماری جیب کو قارون کی تجوری سمجھتی ہے۔ناچیز کی مالی حالت اکثر فضلو دودھ والے کے دودھ سے بھی پتلی رہتی ہے۔ پھر بھی بیگم خود کو ممتاز محل اور ہم کو شاہ جہاں سمجھتی ہیں۔

ہم نیک بخت کو متعدد بار اشاروں کنایوں میں سمجھا چکے ہیں مگر مجال ہے کہ وہ ہماری کسی بات پر کان دھرے۔ لہتی ہے کہ پڑوسن کا میاں اگر لاکھوں میں کما سکتا ہے تو تم کیوں نہیں کما سکتے ؟اب اس کمبخت کو یہ بات کون سمجھائے کہ پڑوسن کا میاں تو کسٹم افسر ہے جہاں دھن ساون کی بارش کی طرح وقت بے وقت برستا رہتا ہے اور ہم ٹھہرے سرکاری کالج کے معلم اور وہ بھی اردو زبان کے۔ سارا دن ردیف قافیہ میں الجھے رہتے ہیں۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی اور صلے میں ملتے ہیں چند ہزار روپے (تنخواہ کے نام پر)۔اتنی قلیل رقم میں زندگی کی گاڑی مشکل سے گھسٹتی ہے اور تو تاج محل کی فرمائشیں کرتی پھرتی ہے۔

گذشتہ چند روز سے اسے یہ بات سمجھانے کیلئے ارادے باندھتے ہیں مگر پھر اس خوف سے توڑ دیتے ہیں کہ کہیں اسے سر درد کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔کل ہی ہماری پڑوسن نے نئی بنارسی ساڑھی خریدی ہے اور بیگم صاحبہ دیکھ چکی ہیں۔اس لئے اسے سر درد پیدا کرنے کے وسطے ذرا سے بہانے کی ضرورت ہے۔ہم بھی اتنے بھولے نہیں کہ بھری ہوئی پستول کی لبلبی پر انگلی رکھ دیں۔☆☆